# ڈیجیٹل دور میں بزرگ شہریوں کا ترقی میں کردار

# Emerging Role for Senior citizens in Didital Era

## The Case of ekhaikk.in

سن ۲۰۱۱ میں سبکدوشی کے بعد میں بہت خوش تھا کہ اب میں وہ سب کچھ کرسکوں گا جو میں اپنی مرضی سے کرنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا کہ ہفتے میں دو دن پڑھانے کے لیے وقف کروں گا اور ایک دن وزارتِ انسانی وسائل وترقی (MHRD)/AICTE کے کام کے لیے ایک دن ایس ایم ایف / آئی آئی ایمز کی فلاحی سرگرمیوں کے لیے اور ایک دن مشاورتی خدمات کے لیے جبکہ اتوار مکمل طور پر فارغ رہا کروں گا۔

یہ تین ماہ تک تو چلتا رہا لیکن اس کے بعد جسم نے جواب دینا شروع کر دیا۔ مختلف بیماریاں لاحق ہونے لگی جن میں سب سے نمایاں گھٹنوں کے جوڑوں کا درد اور دل بھاری بھاری سا محسوس ہونا۔ کسی نہ کسی طرح میں نے مشاورتی کام مکمل طور پر چھوڑ کر خود کو سنبھالا۔ آہستہ آہستہ دیگر امراض نے بھی گھیر لیا اور ۲۰۱۴-۱۵ تک میں دس سے زیادہ بیماریوں کا شکار ہو چکا تھا جن میں آنکھ میں خون رِسنا (haemorrhage)، کانوں میں شور (tinnitus)، سپونڈیلائٹس، پروسٹیٹ کے مسائل، اندرونی خشکی کے باعث خون آنا، نیز اس عمر کی عام بیماریاں جیسے ذیابیطس اور ہائی بلڈ پریشر شامل تھا۔ ان تمام حالات کے نتیجے میں میری علمی سرگرمیاں تقریباً ختم ہوگی تھی۔ آخرکار مجھے گھٹنے کے جوڑ کا آپریشن کرانا پڑا اور ٹھیک ہونے میں مجھے چھ ماہ سے زیادہ وقت لگا۔

اسی دوران ہرنیا کا مسئلہ بھی پیدا ہوگیا۔ عام طور پر یہ ایک سادہ آپریشن ہوتا ہے لیکن میرے لیے یہ ایک ڈراؤنا خواب ثابت ہوا۔ میں چار ماہ تک شدید درد میں مبتلا رہا یہاں تک کہ میں نے اپنے دن گنے شروع کر دیے اور خدا سے دعا کرنے لگا کہ اگر مجھے واپس بلانا ہے تو جلد بلا لے، اتنی تکلیف کیوں؟ ایک

رات مجھے خیال آیا کہ قدرت کسی چیز کو بے وجہ نہیں چھین لیتی۔ میں نے سوچا ''کیا ابھی کچھ کام باقی ہے؟''

مجھے یاد آیا کہ میں نے بہت سال پہلے اپنے طلبہ سے وعدہ کیا تھا کہ ایک کتاب شائع کروں گا مگر کبھی موقع نہ ملا کہ اس کو اچھے سے مکمل کرسکوں۔ یہ ۱۹۹۴ میں آئی آئی ایم لکھنو کے لیے بنائے گئے ایک منصوبے کے تحت اکیڈمک ریسورس پارک کی بنیاد کے خواب کا بھی حصہ تھا۔ میں نے سوچا ''شاید یہی وہ کام ہے جو میں اب کرسکتا ہوں''۔ لیکن انگلیوں کے جوڑوں کا درد مجھے ٹائپ یا لکھنے نہیں دیتا تھا۔ نہ ہی میں ۱۵-۲۰ منٹ سے زیادہ لیپ ٹاپ کی اسکرین دیکھ سکتا تھا کیونکہ نظر پر دھند چھا جاتی تھی اور جوڑوں کا درد شروع ہو جاتا تھا۔ نہ کوئی دفتر تھا، نہ ملازمین جو مدد کے لیے آتے۔

**بڑھاپا اور ڈیجیٹل نظام**

بڑھاپا اپنے ساتھ مختلف قسم کی جسمانی کمزوریاں لے کر آتا ہے۔ تاہم اس کے کچھ فوائد بھی ہوتے ہیں۔ انسان کے پاس زیادہ خالی وقت ہوتا ہے اپنی مرضی سے کام کرنے کی آزادی ہوتی ہے اکثر رات کو نیند کم آتی ہے اور اگر گھر بسا ہوا ہو تو مالی دباؤ بھی کم ہو جاتا ہے۔ لیکن اکثر انسان تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں اور بچوں کے پاس جانے کا دل چاہتا ہے جو دور رہتے ہیں۔ اگر بیوی بھی ساتھ چلی جائے تو خطوط، چیک بک وغیرہ سنبھالنے والا بھی کوئی نہیں رہتا۔ بعض اوقات تو بینک جا کر رقم نکالنا یا بل ادا کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

خوش قسمتی سے ڈیجیٹل نظام تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ہائی ریزولوشن کیمرے والے اسمارٹ فون، براڈ بینڈ اور وائی فائی انٹرنیٹ جیسی سہولیات دستیاب ہیں اگرچہ کچھ حدود کے ساتھ۔ یہ سہولیات انسان کو اپنے آبائی شہر سے دور رہتے ہوئے بھی بہت سے کام انجام دینے میں مدد دیتی ہیں جس سے ہم سب واقف ہیں۔ لیکن کیا ڈیجیٹل دور کا کوئی اور پہلو بھی ہے؟ میرے تجربے کے مطابق، اس دور میں بہت سے نئے

کام کیے جا سکتے ہیں وہ کام (جن کے لیے سبکدوشی سے پہلے وقت نہیں ملتا) اور بڑھاپے میں بھی دادا/نانا کے کردار کو ادا کرتے ہوئے نئی نسل کی معاونت کی جا سکتی ہے۔

## ذاتی مگر مفید تجربات پر مبنی ادب کی تشکیل

بہرحال، میں نے اِدھر اُدھر چند جملے لکھنے شروع کیے۔ جب بھی کوئی خیال ذہن میں آتا چاہے غسل خانے میں، آدھی رات کو (نیند نہ آنے کے دوران) جہاز کے انتظار میں یا ٹرین کے سفر کے دوران میں اسے نوٹ کر لیتا۔ نہ کوئی جلدی تھی اور نہ کوئی پریشانی۔ جب چند صفحے لکھ لیتا تھا تو میں ان کی تصویر کھینچ لیتا یا اسکین کر کے اس کو ای میل کر دیتا جس کا نام ذہن میں پہلے آتا۔ وہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ لکھنؤ یا کوزیکوڈ میں میری پرانی سیکریٹری معاون بھی ہو سکتی تھی، کوئی پروفیسر یا کسی مینجمنٹ ادارے کا ڈائریکٹر بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے جبل پور، کانپور، پونے اور لکھنؤ میں چند قابلِ اعتبار سائبر کیفے بھی تلاش کر لیے تھے جو میرے لیے ٹائپنگ کا کام کر دیتے تھے اور میں پیسے آن لائن دے دیا کرتا تھا۔ تدوین کا کام میں خود کرتا اور پھر کسی فوٹو کاپی کی دکان سے اس کا پرنٹ نکلوا لیتا۔ اسی طریقے سے پانچ سے زائد تحقیقی مقالے، پچیس سے زیادہ مختصر و طویل کیس اسٹڈیز، اور کتابوں کے مختلف ابواب تیار کیے گئے۔

ماضی کے تجربات پر غور و فکر اور اس طرز کی تحریروں کی تیاری نے ہندوستانی اداروں کے طرزِ عمل، طاقت کے ڈھانچے اور ہندوستانی افراد یعنی ''ہندوستان کے ہنومانوں'' کے سلوک کے بارے میں کئی نئی بصیرتیں فراہم کی۔ اس نے مجھے اس بات پر بھی قائل کیا کہ خطرات دراصل مواقع ہوتے ہیں اور کمزوریاں اکثر ذہنی رکاوٹوں کا نام ہیں۔ رکاوٹوں پر قابو پانے کے لیے تخلیقی صلاحیتوں کا استعمال، افرادی قوت کے تصورِ نو (یعنی ترقی اور گونا گوئی کو منظّم کرنے کے تناظر میں)، وسائل (بطور اثاثہ یا بوجھ؟)، شناختی تکنیک کے طور پر چیک لسٹنگ کی قوت، ترقی کو ایک اختیاری عمل سمجھنا، اداروں کی بقا کو یقینی بنانے کی حکمتِ عملی، مختلف شراکت داروں کی حمایت سے فائدہ اٹھانا، اور خود مختاری حاصل کرنے

کے طریقے یہ سب موضوعات نئی فکری جہات کا باعث بنے۔اسی سے مختصر کہانیوں نے جنم لیا، جنہیں بامعنی انداز میں مختصر کیس اسٹڈیز کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے تا کہ کلاس میں دلچسپی پیدا ہواور زیادہ گہرے مباحث کی راہ ہموار ہوسکے۔

طویل تحقیقی کام، جیسے Kingfisher Airlines اور Adani Enterprises کے مطالعات کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا۔اس تحقیقی کام نے اسٹریٹجک مینجمنٹ کے میدان میں کئی تصورات کو مزید نکھارا، مثلاً اسٹریٹجک ڈیریلمنٹ کے عمل کو۔سب سے زیادہ سنسنی خیز تجربہ وہ تھا جب میں نے اسپتال میں سات دن کے دوران، صحت یابی کے مرحلے میں، ایک نوٹ تیار کیا جس نے مجھ میں یہ عملی سوچ پیدا کی کہ کاروبار کس مقام پر لکشمن ریکھا پار کر کے ''لالچ'' کے دائرے میں داخل ہو جاتی ہے۔
رفتہ رفتہ تحریر کیے گئے ان مقالوں کو اکٹھا کیا گیا ان کی ترتیب وتدوین کی گئی اور انہیں منظّم شکل دے کر اسٹریٹجک مینجمنٹ پر مشتمل پانچ جلدوں کے ایک تحقیقی کتاب کی صورت دی گئی۔اسی کے ساتھ اساتذہ کی سہولت کے لیے رہنما کتاب بھی تیار کی گئی تا کہ وہ اپنے تدریسی مقاصد کے مطابق موزوں کیسز کا انتخاب کرسکیں۔

**ویب اپلی کیشن**

جب ان تمام تحریروں کی سافٹ کاپیاں دستیاب ہوگئیں تو میں نے انہیں ایک ویب سائٹ پر اپ لوڈ کرنا شروع کر دیا، جس سے میں نے لکھنؤ میں ذاتی استعمال کے لیے حاصل کیا تھا۔ Strategic Management Forum کی ویب سائٹ چلاتے ہوئے میں نے ابتدائی درجے پر ایسی ویب سائٹس کو استعمال کرنا سیکھ لیا تھا۔اگر چہ یہ ویب سائٹ HTML فارمیٹ میں تھی لیکن اس کے باوجود یہ ایک معلومات کا ذخیرہ بن گئی۔کوئی بھی شخص کسی بھی کیس یا باب کو فوراً اسکرین پر ڈاؤن لوڈ کرسکتا تھا تا کہ تمام شرکا مطالعہ کر کے گفتگو کے دوران ایک ہی فکری سطح پر آسکیں۔ضرورت کے مطابق اضافی

معلومات بھی وقتاً فوقتاً ڈاؤن لوڈ کی جاسکتی تھیں۔

یہ طریقہ مختصر (مختصر شدہ کیس) تحریر کرنے کا ایک موقع فراہم کرتا ہے جس کو کلاس میں بحث کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ مزید مثالوں، نوٹس اور معلومات کے اضافے سے وسعت دی جاسکتی ہے۔

اسی طرح یہ بھی ممکن ہو جاتا ہے کہ کسی طویل اور جامع تحقیقی کام کو چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے جن میں کچھ مثالیں اور معلومات پہلے سے فراہم کر دی جائیں جبکہ مزید مواد کلاس میں گفتگو کے دوران شامل کیا جاتا رہے۔

بعد میں، اسی سال مئی کے مہینے میں میں اپنے پرنٹر کا کارٹریج دوبارہ بھرنے کے لیے گیا تو میں نے دیکھا کہ دکاندار کو ''پی ایچ پی'' فارمیٹ میں ویب ڈیزائننگ اور ویب ہوسٹنگ میں مہارت حاصل ہے جو استعمال کے لیے زیادہ آسان ہے۔ ایک مرتبہ میری HTML ویب سائٹ خراب ہو گئی تھی اور میں بہت بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ میں نے ان کی مدد سے ایک نئ ویب سائٹ (ekhaikk.in) خرید لی اور اسے چلانا اور اس میں تبدیلیاں کرنا سیکھ لیا۔ اس طرح میں دونوں ویب سائٹس کو باری باری استعمال کرنے کے قابل ہو گیا اور ہر ویب سائٹ دوسری ویب سائٹ کے لیے بیک اپ کا کام دینے لگی۔

اس ویب سائٹ نے مجھے یہ سہولت فراہم کی کہ کیس اسٹڈیز، تحریری مواد، تحقیقی مقالے وغیرہ ایک ایسی جگہ محفوظ کیے جاسکیں جہاں سے دنیا کے کسی بھی حصے سے کسی بھی وقت آسانی کے ساتھ ان تک رسائی حاصل کی جاسکے۔

ویب سائٹ نے مجھے یہ مدد بھی دی کہ میں اسٹریٹجک مینجمنٹ کے اساتذہ اور طلبہ کو اپنا مواد استعمال کرنے کی اجازت دے سکوں بغیر اس کے کہ کسی ناشر کی اجازت کے مسائل کا سامنا کرنا پڑے۔ اس مواد کو کم قیمت پر اور ضرورت پڑنے پر مفت بھی تقسیم کیا جاسکتا تھا۔

## طباعت اور اشاعت

میں عموماً مواد کو A4 سائز میں فوٹو کاپی کروا کر اس کی اسپرنگ بائنڈنگ کروالیتا تھا۔ لیکن جب مجھے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کے لیے جانا ہوتا تو یہ جلدیں اٹھانے میں بہت بھاری محسوس ہونے لگتی تھی۔ اتفاق سے میرے قریب ایک ٹیکسی چلانے والے شخص نے زیراکس کا کام شروع کر دیا۔ ہم دونوں نے مل کر تمام کیس اسٹڈیز اور کتابوں کو ۱۸ پوائنٹ فونٹ میں تبدیل کیا اور پھر انہیں A4/2 سائز کے کتابچے کی شکل میں شائع کرنا شروع کیا۔ بائنڈنگ کا کام میں خود کرتا تھا جو میں نے اپنے دفتری معاون کے ساتھ اُس زمانے میں سیکھا تھا جب میں ڈین تھا۔ اس کے نتیجے میں بھاری بھرکم A4 جلدیں نسبتاً ہلکی اور آسانی سے اٹھائی جانے والی کتابوں میں تبدیل ہو گئی۔ میں نے بڑی کتابوں کو چھوٹا کر کے ۱۰۰-۱۵۰ صفحات پر مشتمل A4/2 سائز کے حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کے باوجود جب بھی میں لکھنؤ سے دہلی یا بنگلور جاتا تو مجھے یہ بھاری کتابیں اپنے ساتھ لے جانی پڑتی تھی جو ایسے شخص کے لیے بہت مشکل تھا جسے خود دوسروں کے سہارے چلنا پڑتا تھا۔

آخر کار میں نے فیصلہ کیا کہ پورا مواد مرحلہ وار آن لائن اپ لوڈ کروں اور جہاں بھی جانا ہو وہاں فوٹو کاپی حاصل کر لیا کروں تا کہ میرا کام نہ رکے۔

گڑگاؤں میں، میں نے Soft Cover والی کتابی شکل میں طباعت اور بائنڈنگ کے امکانات تلاش کیے۔ اس سلسلے میں میں نے اُس شخص سے رابطہ کیا جو فوٹو کاپی کا کام کرتا تھا اور مواد گھر تک پہنچا دیتا تھا کیونکہ DISH نامی بیماری کے آخری مرحلے کے باعث میں گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ اس بیماری کی وجہ سے شدید چکر آتے تھے یہاں تک کہ گھر کے اندر چلنا پھرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ میں نے لکھنؤ، مدانتا گڑگاؤں، منی پال ہسپتال اور نارائنا ہردیالیہ کے ڈاکٹروں سے رابطہ کیا مگر کوئی مثبت نتیجہ سامنے نہ آیا۔ ایک بار پھر زندگی سے امید ختم ہونے لگی۔ خوش قسمتی سے ایک ایکیوپریشر ماہر نے مقناطیسی

علاج (magnet therapy) کی جس سے میری حالت میں کچھ بہتری آئی۔

دھیرے دھیرے فوٹو کاپی والے سے میری دوستی ہوگی اوراس نے وعدہ کیا کہ جہاں بھی میں چاہوں گا وہ کوریئر کے ذریعے مواد بھجوا دے گا۔ مجھے صرف سافٹ کاپی بھیجنی ہوتی تھی باقی تمام کام وہ خود کرلیتا اور میں الیکٹرانک ترسیل کے ذریعے پیسے بھیج دیا کرتا تھا۔

بنگلور میں اپنی کالونی کے قریب چہل قدمی کے دوران میری نظر فرانسیسی جرمن اور ہسپانوی زبانیں سکھانے والے ایک اشتہار پر پڑی۔ وہاں ایک شخص سے دوستی ہوگئی اوراس نے وعدہ کیا کہ وہ میری ایک کہانی کا ترجمہ تین غیر ملکی زبانوں میں کرے گا۔ میں نے خود بھی گوگل کی مدد سے ہندی ٹائپنگ سیکھ کراس کہانی کا ہندی میں ترجمہ کیا۔ رفتہ رفتہ وہ کہانی جو پہلے The Hindu میں شائع ہوچکی تھی بارہ زبانوں میں ترجمہ ہوکر ویب سائٹ پر ڈال دی گئی۔

بعد میں اس مترجم دوست نے میری پوری پچیس کہانیوں کا بھی تین غیر ملکی زبانوں میں ترجمہ کردیا۔ اس طرح (دادا جی کی کہانیاں) پانچ زبانوں میں دستیاب ہوگئی۔

جب میری کہانیوں کی کتاب پانچ زبانوں میں شائع ہوئی جن میں سے تین زبانیں ہندوستان میں زیادہ نہیں بولی جاتیں تو مجھے محسوس ہوا کہ اسے دوسرے مما لک تک پہنچنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے ان کتابوں کے لیےISBN نمبر حاصل کرنے کا طریقہ سیکھا اورانہیں عالمی قارئین کے لیے ویب سائٹ پراپ لوڈ کر دیا۔ اسی عمل کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ ISBN نظام (MHRD) کے تحت خود اشاعت (Self-publication) کی اجازت دیتا ہے۔ لہٰذا میں نے خوداشاعت کا راستہ اختیار کیا تا کہ اپنی تحریروں کو کاروباری منافع ڈھونڈنے والے ناشرین پرانحصار کیے بغیر سب کے لیے مہیا کرسکوں۔

بعد میں میں نے بنگلور میں ایک ایسے زیراکس والے کی تلاش کی جو کم خرچ میں کتابیں شائع کر سکے۔ مجھے ایک ایسا شخص مل گیا جو کم پیسوں میں کتابیں چھاپ سکتا تھا۔ اس سے میری یہ ضرورت پوری ہوگئی کہ

اہم شخصیات کے لیے ضرورت کے مطابق صرف ایک نسخہ بھی شائع کیا جا سکے۔ اسی دوران میں نے کتابوں کو Ebook اور Paperback دونوں صورتوں میں اشاعت کے لیے فارمیٹ کرنا بھی سیکھ لیا۔

## آئی آئی ایمز کی مشترکہ ویب سائٹ

آئی آئی ایم کے میں بطور ڈائریکٹر مجھے اکثر دوسرے اداروں کے ماہرین کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اس طرح بہت سے لوگ مختلف مقاصد کے لیے مجھ سے آئی آئی ایمز کے بارے میں معلومات طلب کرتے تھے۔ ہر آئی آئی ایم کا الگ آئی پی ایڈریس تھا جسے یاد رکھنا مشکل تھا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے تعلیمی اور غیر تعلیمی استعمالات ممکن تھے۔ چنانچہ میں نے تمام آئی آئی ایمز کی ویب سائٹس پر موجود معلومات اور لنکس کو یکجا کر کے ایک مشترکہ ویب سائٹ تیار کی تاکہ فوری حوالہ میسر آ سکے۔ اب صرف ایک ویب سائٹ ایڈریس، www.iimsworld.in، یا صرف www.ekhaikk.in یاد رکھنا کافی تھا جہاں سے کسی بھی آئی آئی ایم کی ویب سائٹ تک رسائی حاصل کی جا سکتی تھی۔

جب میں اپنی تحریروں کے ترجمے کروا رہا تھا تو میں نے سوچا کہ انگریزی واقفیت نہ رکھنے والے افراد کو بھی بڑھتے ہوئے آئی آئی ایم خاندان کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔ اسی لیے میں نے اس مشترکہ ویب سائٹ کا ترجمہ بھی چھ زبانوں میں کروا دیا تاکہ دنیا بھر کے لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔

## تحقیق

۲۰۱۱ میں، انا ہزارے کی قیادت میں ایک تحریک شروع ہوئی، جو ٹو جی سپکٹرم کیس کے سلسلے میں سپریم کورٹ آف انڈیا کے فیصلے کے بعد سامنے آئی۔ اس کے بعد ۲۰۱۲ میں کوئلہ بلاک الاٹمنٹ سے متعلق رپورٹ منظر عام آئی۔ پارلیمنٹ میں شدید بحثیں شروع ہو گئیں اور مرکزی حکومت پر بدعنوانی کے الزامات لگائے جانے لگے۔ یہ میرے لیے ایک شدید صدمہ تھا۔ کیا وزراء جھوٹ بول رہے تھے؟ حقائق

جانچنے کا کوئی آسان طریقہ موجود نہیں تھا۔کوئلہ کے وزیر یہ کہہ رہے تھے کہ اس معاملے میں ان کا کوئی کردار نہیں تھا اور ان کے دورِ وزارت میں کوئی کوئلہ بلاک الاٹ نہیں کیا گیا۔ایک دن اتفاقاً میں وزارتِ کوئلہ کی ویب سائٹ پر پہنچ گیا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان کے دور میں ۴۰۰۰ میٹرک ٹن سے زائد کوئلہ بلاکس الاٹ کیے گئے تھے۔ میں حیران ہوگیا۔ یہ تمام معلومات خود وزارتِ کوئلہ کی ویب سائٹ پر موجود تھی۔مزید تجزیے سے یہ بات سامنے آئی کہ الاٹمنٹ کے عمل میں شدید من مانی کی گئی تھی۔CAG کی جانب سے قومی خزانے کو ہونے والے نقصان کا تخمینہ چونکا دینے والا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ تھی کہ میرے تجزیے کے مطابق اصل نقصان اس سے کہیں زیادہ تھا۔تاہم اس فرق کا درست تجزیہ کرنے کا کوئی واضح طریقہ موجود نہیں تھا۔

صنعتی پیشواؤں کے رویّے کے بارے میں بھی میرے ذہن میں کئی سوالات پیدا ہونے لگے۔کیا وہ واقعی بے ایمانی میں ملوث ہیں؟ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر طرف گھوٹالوں کی بھرمار ہے۔ان کے تجارتی فیصلوں میں ملک کے مفاد کا کتنا خیال رکھا جاتا ہے؟ اگر یہ گھوٹالے واقعی درست ہیں تو کیا صنعت اور معیشت محفوظ ہاتھوں میں ہیں؟ کیا یہ بات تمام صنعت کاروں پر یکساں طور پر لاگو کی جاسکتی ہے؟ ایماندار اور بے ایمان صنعت کاروں میں فرق کیسے کی جائے؟ آخر کون سی چیز انہیں غلط راستے پر ڈالتی ہے؟ کیا حکومتی فیصلہ سازی خود انہیں ایسے اقدامات کی ترغیب دیتی ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو ان کی اصلاح کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں؟ اگر عدالتیں انہیں جیل بھیجنا شروع کر دیں تو پھر سماج کی ضروریات پوری کرنے کے لیے صنعتیں کون چلائے گا؟ میڈیا کا کردار کیا ہے؟ کیا وہ عوام کو صحیح تصویر دکھا رہا ہے اور اپنی ذمہ داری دیانت داری سے نبھا رہا ہے؟ کیا عدلیہ اتنی مؤثر ہے کہ ان چیلنجز سے تیزی کے ساتھ نمٹ سکے؟ ایسے سوالات میرے ذہنی سکون کو بری طرح متاثر کرنے لگے۔

ایک دن اتفاقاً میں CAG کی ویب سائٹ پر پہنچ گیا جہاں مجھے کوئلہ بلاک الاٹمنٹ سے متعلق سی اے

جی کی رپورٹ دیکھنے کو ملی۔ اس کے تجزیے سے معلوم ہوا کہ فرق کی وجہ بعض ایسے قیاس تھے جو سی اے جی نے اختیار کیے تھے اور میرے خیال میں وہ زیادہ قابلِ قبول نہیں تھے۔ میرے تجزیے سے یہ بات سامنے آئی کہ قومی خزانے کو ہونے والا نقصان سی اے جی کے اندازوں سے دوگنا سے بھی زیادہ تھا۔ یہ مقالہ اپریل ۲۰۱۴ میں ایک کانفرنس کے لیے بھیجا گیا اور مئی ۲۰۱۴ میں وزیرِ اعظم کے عوامی پورٹل کے آغاز کے بعد انہیں بھی ارسال کیا گیا۔ اگست ۲۰۱۴ میں سپریم کورٹ آف انڈیا نے من مانی اور غیر قانونی طریقہ کار کی بنیاد پر اس تخصیص کو منسوخ کر دیا اور صرف سی اے جی کی نشان دہی کردہ بلاکس ہی نہیں بلکہ تمام بلاکس کی نیلامی کا حکم دیا۔ جب نیلامی کا عمل شروع ہوا تو میرے اندازے درست ثابت ہونے لگے۔

اگست ۲۰۱۳ کے دوران پارلیمنٹ میں ملٹی برانڈ ریٹیل (MBR) کے شعبے میں براہِ راست غیر ملکی سرمایہ کاری (ایف ڈی آئی) پر بحث شروع ہوئی۔ پارلیمنٹ میں شدید ہنگامہ آرائی ہوئی۔ وزیرِ اعظم نے کہا کہ اگر یہ اقدام نہ کیا گیا تو ملک کو ۱۹۹۱ سے بھی بدتر معاشی ایمرجنسی کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ وزیرِ خزانہ نے کہا کہ ملٹی برانڈ ریٹیل میں ایف ڈی آئی اب انتخاب کا نہیں بلکہ مجبوری کا معاملہ بن چکا ہے۔ یہ سن کر میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اگر بیس برس کی معاشی اصلاحات کے بعد بھی ہم دوبارہ اسی یا اس سے بدتر صورتِ حال میں پہنچ گئے ہیں تو کیا اصلاحات واقعی درست سمت میں جا رہی تھیں؟ ریزو بینک آف انڈیا اور دیگر معتبر ذرائع کے گہرے تجزیے سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی افواہ نہیں بلکہ حقیقت تھی۔ اس صدمے سے مجھے تقریباً دل کا دورہ پڑ گیا اور مجھے فوری طبی معائنے کے لیے ایمرجنسی میں لے جایا گیا۔ دستیاب معلومات یہ بھی ظاہر کر رہی تھیں کہ معاملہ اتنا سادہ نہیں جتنا بظاہر نظر آتا ہے اور حوالا (hawala) اور منی لانڈرنگ کے الزامات شاید درست ہوں۔ اس تجزیے نے یہ سوچنے پر بھی مجبور کیا کہ شاید پورے معاشی اصلاحاتی عمل پر از سرِ نو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ مندرجہ بالا دو تحقیقی مقالات

Adani Enterprises اور Kingfisher Airlines کی دو کیس اسٹڈیز نے یہ ظاہر کیا کہ ڈیجیٹل دور میں سبکدوش ماہرینِ تعلیم حتیٰ کہ بستر پر لیٹے ہوئے مسلسل جسمانی تکلیف اور اذیت کے باوجود نہایت بامعنی تحقیق کر سکتے ہیں۔ یہ وہ کام ہے جو وقت کی شدید کمی کے باعث نوجوان اساتذہ کے لیے اکثر دشوار ہوتا ہے۔

جب میں اپنے گزشتہ چالیس برس کے تحقیقی سفر کو یاد کر رہا تھا تو مجھے محسوس ہوا کہ اگرچہ ہر تحقیقی کام الگ الگ انجام دیا گیا اور اس نے مختلف مسائل پر مفید بصیرتیں اور قیمتی سفارشات فراہم کی لیکن ان سب کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ان کی ایک اور اہمیت بھی سامنے آتی ہے۔ یہ تمام تحقیقات ہندوستان میں معاشی آزادکاری (Liberalisation) کے بعد ہونے والی پیش رفت ضائع ہونے والے مواقع، اور ان تمام مسائل خواہ وہ آلودگی ہو، ٹریفک جام ہوں، روزگار کے بغیر ترقی ہو یا سرمایہ کاری کا بحران سے نمٹنے کے ممکنہ راستوں کو ایک تاریخی تناظر فراہم کرتی ہیں۔ اسی لیے ان تمام تحقیقات کو Post Liberalisation Developments in India: A 25 Years Reserch Journey کے عنوان سے پانچ جلدوں پر مشتمل ایک مجموعے کی صورت میں شائع کیا جا رہا ہے۔

**تدریس / مینجمنٹ ڈیولپمنٹ پروگرام**

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف مینجمنٹ کوزیکوڈ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے مجھے آن لائن کورسز شروع کرنے کا براہِ راست تجربہ حاصل ہوا جس میں کیس اسٹڈیز پر مبنی مباحثے بھی شامل تھے۔ میں نے یہ پایا کہ یہ مباحثے روایتی کلاس روم کی گفتگو کی طرح نہایت فعال اور جاندار ہوتے ہیں۔ چھ نئے آئی آئی ایمز کے قیام سے متعلق اپنی رپورٹ میں، میں نے ویڈیو کانفرنسنگ سہولیات قائم کرنے کی سفارش بھی کی تھی۔ لیکن اس سے بڑھ کر میرا احساس یہ تھا کہ نئے آئی آئی ایمز بلکہ پرانے ادارے بھی اس بات سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں کہ مہمان مقررین کے لیکچرز، نیز باقاعدہ پروگراموں اور MDPs میں بعض لیکچرز،

دور دراز علاقوں سے بھی منعقد کیے جائیں اور اس مقصد کے لیے مہمان مقرر کے مقام پر ویڈیو کانفرنسنگ اسٹوڈیو کی موجودگی ضروری نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے ٹیکنالوجی دستیاب تھی اور میں اس حوالے سے عملی تجربات کرنے کے لیے تیار تھا لیکن میری کوششیں ناکام رہیں کیونکہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ لوگ اس پر آزمایش کرنے سے بھی مکمل گریز کرتے ہیں۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ اس عمل کو ہموار اور بے رکاوٹ بنایا جائے اور یہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسے عملی طور پر استعمال میں نہ لایا جائے۔ اس کے ممکنہ فوائد مثلاً اخراجات میں نمایاں کمی، وقت کی بچت وغیرہ بے حد اہم ہیں لیکن ان سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا۔ حتیٰ کہ آئی ٹی فیکلٹی بھی اس سمت میں آمادہ نظر نہیں آتی۔ میرے خیال میں اس پر فوری طور پر تجربہ کیا جانا چاہیے۔

ایم ڈی پی پروگراموں کے حوالے سے میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اگر کورس کا مواد انٹرٹینمنٹ شیٹ (اگلا حصہ دیکھیے) میں شامل کر دیا جائے تو وقفے کے دوران تفریح کے ساتھ ساتھ نہایت سہولت سے کلاس جاری رکھی جا سکتی ہے۔

## تفریح

سبکدوش افراد کے لیے ایک تفریحی ویب سائٹ بنانے کا خیال اُس وقت آیا جب میں بستر تک محدود ہو گیا تھا اور مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وقت کیسے گزاروں کیونکہ شدید چکر آنے کے باعث نہ میں چل پھر سکتا تھا اور نہ ہی روزمرہ کے کام انجام دے سکتا تھا۔ میں نے "YouTube" پر موسیقی کے پروگرام دیکھنے شروع کیے۔ وہاں میں اپنے پسندیدہ گانے سن سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مزاحیہ لطیفے، غزلیں، ہاسیہ کوی سمیلن اور اس نوعیت کی دیگر چیزیں بھی موجود تھیں۔ میں نے ان سب کو ایک Excel شیٹ میں شامل کیا اور پھر اسے اپ لوڈ کر دیا۔ رفتہ رفتہ نئی نسل کے گانے بچوں کے لیے مواد اور WhatsApp سے موصول ہونے والے مختلف کلپس بھی اس میں شامل کر دیے گئے۔ میں نے یہ سب اپنے ذاتی استعمال

کے لیے اپ لوڈ کیا تھا تا کہ جب کبھی اکتاہٹ، ذہنی دباؤ یا بے خوابی کا سامنا ہو تو ان سے لطف اندوز ہو سکوں۔ اس مقصد کے لیے میں نے کئی جوڑے ائرفونز، مختلف موبائل سروس فراہم کرنے والوں کے تین وائی فائی / براڈ بینڈ ڈونگل، دو اسپیکر سیٹس، اور دو موبائل فون خریدے۔ اس کام میں میرے دو پرانے لیپ ٹاپس نے بھی معاونت کی۔

اسی کے ساتھ میں نے مختلف بیماریوں کے حوالے سے اپنے ڈاکٹروں کی تفصیلات، مختلف شہروں میں دوا خانوں کے رابطہ نمبر، بینک اکاؤنٹس کی معلومات (لاگ اِن سمیت)، بک شدہ ٹکٹوں کی تفصیلات، ٹیکسی نمبرز اور دیگر ضروری معلومات بھی اس میں شامل کر دیں جن کی مجھے وقتاً فوقتاً ضرورت پیش آتی تھی۔ یہ سب کچھ میرے سامان کا ایک لازمی حصہ بن گیا گویا ایک محفوظ بیگ کی مانند۔ میرا خیال ہے کہ ڈیجیٹل دور ۵۶ سال سے زائد عمر کے افراد کو یہ منفرد موقع فراہم کرتا ہے کہ وہ نئی نسل پر بوجھ بنے بغیر اپنی زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں۔

اس طرح ڈیجیٹل دور نے مجھے علمی اور غیر علمی دونوں نوعیت کی خدمات انجام دینے کے بے شمار مواقع فراہم کیے۔

۱۔ آئی آئی ایمز کا باہمی انضمام

۲۔ کثیر لسانی ویب سائٹ کے ذریعے آئی آئی ایمز کو عالمی سطح پر متعارف کرانا

۳۔ بارہ زبانوں میں کثیر لسانی کہانیوں کی تیاری

۴۔ مختصر مگر بصیرت افروز مینجمنٹ کہانیوں کی پہلی کھیپ (۱۹۸۷) کی تیاری

۵۔ ضرورت اور دلچسپی کے مطابق مخصوص کتابوں کی تیاری) نیچے دی گئی تصاویر پر کلک کریں(

| Sh. Narendra Modi | Sh. Prakash Javadekar | Shri Rahul Gandhi | M. Emmanuel Macron | SR. Mariano Rejoy | Frau Angela Merkel |
|---|---|---|---|---|---|
| PM (India) | MHRD (India) | MP (India) | President (France) | PM (Spain) | Chancellor (Germany) |

۶۔کیس میتھڈ اور کیس رائٹنگ کے ذریعے تدریس میں معاونت کے لیے کتاب کی تیاری

۷۔کم دام، مفت اور لچکدار کیس بکس کا آغاز

۸۔اسٹریٹجک مینجمنٹ کے مضمون کو آسان زبان میں سمجھانے کے لیے کم قیمت یا مفت مواد ضرورت مند افراد تک پہنچانا

۹۔تحقیق، تحقیقی اشاعت

۱۰۔بستر یا ICU سے اور تدریس کا عمل

۱۱۔بغیر نقل و حرکت کے تفریح کے ذرائع فراہم کرنا

**آنے والے چیلنجز**

ہر تکنیکی پیش رفت اپنے ساتھ کچھ چیلنجز بھی لے کر آتی ہے۔ میرے نزدیک اس سلسلے میں چار بنیادی چیلنجز درج ذیل ہیں:

۱۔**اخراجات کا مسئلہ:** ٹیکنالوجی کی تیز رفتار تبدیلی اور جلد متروک ہو جانے کی وجہ سے اخراجات میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہر سبکدوش شخص شاید ہر ایک یا دو سال بعد مہنگے اسمارٹ فون اور لیپ ٹاپ خریدنے کی استطاعت نہ رکھتا ہو۔ اس کے ساتھ انٹرنیٹ سروس کے اخراجات بھی جڑے ہوتے ہیں جو ان تمام مقاصد کے لیے ضروری ہیں۔

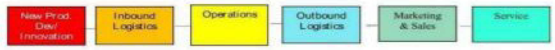


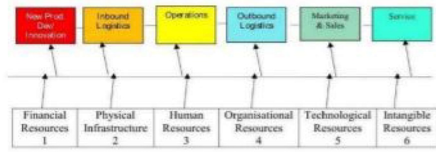


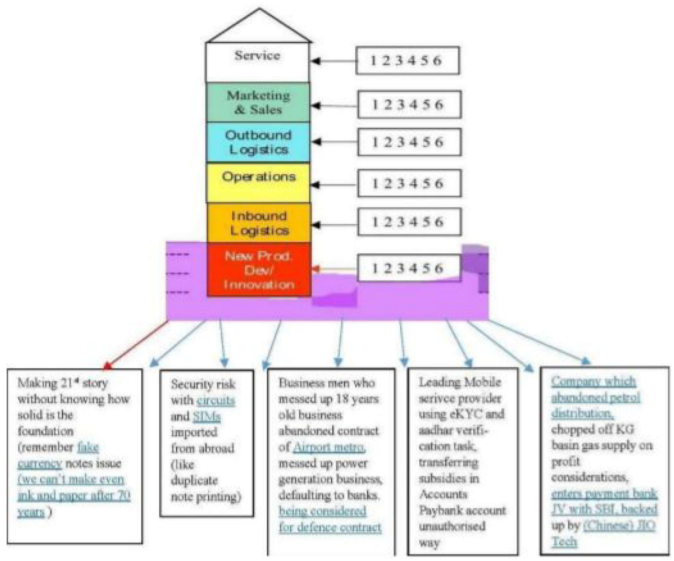


**۲۔غیر یقینی صورتِ حال:** موبائل فونز، لیپ ٹاپس اور پرنٹرز کے حوالے سے غیر یقینی کی سطح بہت زیادہ ہے۔اسکی وجہ صرف ٹیکنالوجی کا تیزی سے پرانا ہوجانا نہیں بلکہ باہمی مطابقت(compatibility) کے مسائل بھی ہیں۔ یہ مسائل بعض اوقات شدید مایوسی پیدا کردیتے ہیں یہاں تک کہ انتہائی پرامید شخص بھی دل برداشتہ ہوسکتا ہے۔

**۳۔ بڑھاپے میں سیکھنے کا مسئلہ:** ایک ایسے ملک میں جہاں نوجوانی میں بھی سیکھنا ایک چیلنج سمجھا جاتا ہے وہاں عمر رسیدہ افراد کے لیے نئی ٹیکنالوجی اوراس کے استعمال کو سیکھنا آسان نہیں۔ خاص طور پر کمپیوٹرز اور موبائلز کے ''NO NONSENSE'' اندازِ استعمال کے ماحول میں۔ اگر گھر میں مدد کے لیے کوئی نوجوان موجود نہ ہوتو یہ صورتِ حال ایک ڈراؤنے خواب کی مانند بن سکتی ہے اور بزرگ افراد خاموشی سے اس احساس کا شکار ہوجاتے ہیں کہ ''میں جدید چیزیں سیکھنے کے لیے بہت بوڑھا ہو چکا ہوں''۔

**۴۔ پائیداری:** شاید سب سے اہم چیلنج ٹیکنالوجی کی پائیداری کا ہے، خاص طور پر ایسی صورت میں جب

ملک درآمدات پر انحصار کرتا ہو۔ ایک ایسے ملک کے لیے جو دہشت گردی کی مالی معاونت جیسے خطرات کے باوجود اپنی کرنسی نوٹوں کی طباعت کے لیے درکار کاغذ اور سیاہی تک خود تیار نہیں کر سکتا وہاں ایسی ٹیکنالوجی پر انحصار جس کے تمام اہم پرزے بیرونی یا حتیٰ کہ مخالف ممالک سے درآمد کیے جاتے ہوں ایک سنجیدہ سوال پیدا کرتا ہے۔ جب صنعت کار بار بار تجارت اور توسیعی کاروباری سرگرمیوں میں ناکام ہو رہے ہوں جس کے نتیجے میں (بھاری NPA) پیدا ہو رہے ہوں اور وہ بغیر تجربے یا مہارت کے نئے کاروباروں میں داخل ہو رہے ہوں اور بڑے قرض نادہندہ بن رہے ہوں تو یہ سوال فطری طور پر پیدا ہوتا ہے کہ اندرونی سطح پر نئے مصنوعات کی تیاری کی کوششوں کے بغیر ایسی حکمتِ عملی آخر کتنی محفوظ اور پائیدار ہو سکتی ہے؟ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی عمارت کی اکیسویں منزل کو خوبصورتی سے سجانے میں مصروف ہو جائیں جبکہ خود بنیاد کی مضبوطی کے بارے میں یقین نہ ہو۔

Prof. Krishna Kumar
kk661946@gmail.com
ekhaikk@gmail.com
kk@iiml.ac.in
www.ekhaikk.in

9415126367 bsnl 7991323262 airtel
9453023432 idea 9696561946 jio
6390099055 vodaphone

**End Result**
***Literature on***
***Strategic Management***